ڈاکٹر معین الدین عقیل

تذکرہ نویسی کے دَور میں تاریخ نویسی کی ایک وقیع مثال: اردو زبان و ادب کی اوّلین تاریخ

Garcin De Tassy was among the most important orientalists in 19th century, who, comparatively, devoted his whole academic life especially in the studies of Muslim society and culture of South Asia. Besides, he contributed highly valuable research in Indian languages and literature and historiography of Hindvi and Hindustani (Urdu). In this field, among many other remarkable works in French language, his Histoire de la Literatuer Hindouie et Hindoustanies is highly important and most useful source for the studies and research on Urdu language and literature until late 19th century from the beginning. It was first published in 1839 and then as its second volume in 1847. But later he continuously added his research and enlarged it in 3 volumes which were published in 1870-71 in Paris. De Tassy's several work, which was in French language, have been translated in English and even in Urdu but this huge Histoire is not published so far and translated in any language, however a research scholar Lillian SekistienNazro attempted to translate this into Urdu as her research project for Ph.D degree from University of Karachi in 1961 and succeeded. This Urdu translation has been not published yet but it is now ready to be published with an Introduction and Appendices by the writer of this article.
This article is based on the unpublished introduction, which the writer has written for the above translation that covers the evaluation and details of De Tassy's contributions in Urdu language and literature.

جنوبی ایشیا میں ادب اور بالخصوص اردو زبان و ادب کی تاریخ نویسی نوآبادیاتی دَور کا ثمر ہے جب جدید علوم کے اثرات سے ہمارہ معاشرہ فیض پانے کے قابل ہورہا تھا اور زبان اور ادب کی نوعیت اور اس کے معیار کا تعین بھی اب معاشرے کے محرکات اور تقاضوں کے مطابق کیا جانے لگا تھا۔ تاریخ نویسی کا عمل قبل ازیں محض سیاسی واقعات کو محفوظ کرنے یا ترتیب دینے یا اکابر کی سوانحات تحریر کرنے تک محدود تھا۔ اس عمل میں مملکتوں اور حکمرانوں کے احوال تو

ہماری روایتی تاریخوں میں خوب خوب جگہ پاتے رہے جن میں اگر کوئی بہت مبسوط اور جامع تاریخیں لکھی گئیں تو ان میں سیاسی مدبّروں، دانش وروں، اور علماؤں و شاعروں کے احوال بھی شامل ہوتے رہے۔اسی عمل کے ذیل میں تذکرہ نویسی نے فروغ پایا جس میں رفتہ رفتہ تحقیق وتنقید کے عناصر بھی گاہے گاہے جگہ پاتے رہے۔ یہی عناصر ،بعد میں ادبی تاریخ نویسی کے عمل میں اس کا معیار بنتے رہے ہیں۔

تاریخ،تحقیق اور تنقید کا باہمی امتزاج اور اشتراک ہمیں ابتداً شعراء کے معیاری تذکروں میں نظر آتا ہے جس کے زیر اثر تذکرہ نگار،شعراء کا کلام منتخب کرتے رہے اور کہیں کہیں ان کی شخصیت اوران کے ذوق وفن کی جانب اشارے بھی کرتے رہے ۔پھران میں گاہے گاہے تحقیقی اور تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے۔ابتدائی تذکرہ نگاروں میں قائم (''مخزنِ نکات''، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۱ء) اورمیرحسن (''تذکرۂ شعرائے اردو''، ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۴ء) اس وقت وہ تذکرہ نگار تھے جنھوں نے اپنے تذکروں میں شعراء کواس وقت کے عام رواج کے مطابق ،حروفِ تہجی یا کسی بے ترتیبی کے بجائے متقدمین،متوسطین اور متاخرین (یا معاصرین) جیسے ادوار میں تقسیم کر کے اپنے نیم پختہ سے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔قدرت اللہ شوق کا تذکرہ''طبقات الشعراء'' (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۲ء)اس شعور میں کچھ اضافے کا پتا دیتا ہے۔میرحسن نے اگرچہ شاعروں کوحروفِ تہجی ہی کے اعتبار سے شامل کیا لیکن پھر اسی ترتیب میں انھوں نے مذکورہ طبقات وضع کیے تھے،جب کہ قائم نے حروفِ تہجی کے بجائے مذکورہ تاریخی ترتیب کوملحوظ رکھا تھا۔شوق نے کچھ آگے بڑھ کر اس ترتیب کو زمانی اور طبقاتی اور کچھ موضوعاتی لحاظ سے بھی تقسیم کیا ،لیکن یہ کوششِ خام سے زیادہ نہیں اور شعرأ کو اس طرح طبقاتی، زمانی وتاریخی نسبت کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے کہ یہ عمل ان شعراء کے ساتھ اور ان کے عہد کے ساتھ زیادتی سے کم نہیں۔یعنی معاصرین کو بھی انھوں نے زمانی اعتبار سے تقسیم کردیا جو یا تو معلومات کی کمی کے باعث ہُوا یا تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہُوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک تذکروں میں''گلشنِ بے خار''(۱۸۳۵ء) واحد اور جامع تذکرہ ہے جس میں تذکروں کی قدیم مسلمہ روایت کے ساتھ ساتھ تنقید اور معیار کو بھی اہمیت حاصل ہوتی نظر آتی ہے، جو اسی روایت کے تسلسل میں کوئی نصف صدی کے بعد''آبِ حیات'' میں یکجا ہوجاتی ہے ،جس میں اب شعرأ کے تذکرے کے ساتھ ساتھ لسانی تحقیق، ادبی تنقید اور تاریخ اور سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے بھی ملتے ہیں۔اسی بنا پر یہی ہماری تاریخ نویسی کا آغاز ہے اور تنقیدی شعور اور تحقیقی جستجو کے باعث اب تذکرہ نگاری تاریخ نویسی میں ضم ہوجاتی ہے۔ یوں تذکرے بعد میں بھی ، یعنی بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھی لکھے جاتے ہیں اور اس طرح یہ روایت یکسر ختم تو نہیں ہوتی لیکن نوعیت اور مقصد اب مختلف ہیں اور اہمیت تاریخ نویسی کو حاصل ہے۔

نوآبادیاتی عہد کے دورِ اول (۱۸۵۷ء) تک تذکروں میں تاریخی اور تنقیدی شعور کا نسبتاً بہتر اظہار مولوی کریم الدین کے ''تذکرۂ طبقات الشعرائے ہند''(۱۸۴۸ء) سے نظر آنے لگتا ہے ،جس کو تاریخی وتنقیدی احساس کا حامل ایک

زیادہ،بہتر تذکرہ کہا جاسکتا ہے اور چوں کہ اس کا محرک اور اس کی بنیاد گارسیں دتاسی کی ''تاریخ ادبیات ہندوی وہندوستانی'' تھی، جو دراصل تذکرہ بلکہ تاریخ شعرا ہی ہے اور اس وقت، جب کہ یورپ میں بھی ادب کی تاریخ دراصل شاعری ہی کی تاریخ سمجھی جاتی تھی،گارسیں دتاسی کی تاریخ واقعتاً ہمارے تذکروں کی ایک زیادہ مکمل، ضخیم اور ترقی یافتہ صورت ہے اور ایک لحاظ سے ہماری تذکرہ نویسی کے دور میں ادبی تاریخ نویسی کی سب سے پہلی کوشش بھی ہے لیکن جنوبی ایشیا میں نہیں یورپ (پیرس ،فرانس) میں۔

گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔۱۸۷۸ء) بلاشبہ انیسویں صدی کے مستشرقین میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اردو تحقیق اور مطالعۂ اسلام کے ضمن میں اس کے تحقیقی مطالعات نے اپنے موضوعات پر ایسا ذخیرۂ مآخذ فراہم کردیا ہے کہ جن سے استفادے کے بغیر اردو زبان و ادب اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب کا کوئی مطالعہ ،خصوصاً انیسویں صدی کے تعلق سے،جامع اور مستند نہیں ہوسکتا۔وہ ایک کثیر التصانیف محقق ومصنف تھا اور سب کچھ فرانسیسی زبان میں لکھتا رہا۔اس کی محض چند کتابیں ، اس کے انتقال کے کوئی نصف صدی کے بعد ہی کسی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوئیں یا پھر ہمارے دانشوروں اور محققین ومصنفین نے اپنے ذوق وشوق اور اپنے مطالعات کے سلسلے میں جب خصوصاً فرانس میں وقت گزارا تو اردو کے تعلق سے اس کی تحقیقات سے واقفیت حاصل ہونے اور ان کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کی وجہ سے اردو زبان میں ان کے ترجموں کو ضروری سمجھا اور یوں اس کے ''خطبات'' اور ''تمہیدی خطبات'' جیسے مجموعوں کی صورت میں اس کی تحقیقات بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اردو میں منتقل ہوئیں اور اردو محققین کے لیے اہم مآخذ ثابت ہوئیں۔پھر یہی مجموعے قدرے ترمیم وتصحیح کے ساتھ سن ساٹھ اور ستر کی دہائی میں شائع ہوئے۔

اس عمل کے دوسرے مرحلے میں اس کی بعض تصانیف کو، جو اردو زبان و ادب کے لیے مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے اردو شعرا کے تذکروں پر اس کے مطالعات جنھیں اولاً منشی ذکا اللہ دہلوی (۱۸۳۲ء۔۱۹۱۰ء) نے اردو میں ترجمہ کیا اور بعد میں اسے اضافی معلومات کے ساتھ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (۱۹۲۵ء۔) نے مرتب و شائع کیا۔اسی کام کو ڈاکٹر ریاض الحسن (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۲ء) نے بھی انجام دیا(ان تصانیف کی تفصیلات اگلے صفحات میں مقدمے کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں)۔یہ سب ہُوا لیکن افسوس کہ اردو تحقیق کے ضمن میں دتاسی کی سب سے اہم تصنیف، اس کی ''تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی''، Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie، جو اولاً ۱۸۳۹ء میں،اور پھر ۱۸۴۷ء میں (بطور جلد دوم) اور بعد میں بہت قیمتی وتازہ اضافوں کے ساتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی ،لیکن اپنی اشاعت کے ۹۰ سال گزرنے اور اردو زبان و ادب کا انتہائی ناگزیر ماخذ ہونے کے باوجود نہ انگریزی میں اور نہ ہی اردو میں ترجمہ ہوکر منظرِ عام پر آئی، جب کہ دتاسی کی مذکورہ

تصنیف(تذکرہ مشعرا) سے قطع نظر،اس کے سارے ہی خطبات کومذکورہ بالا صورتوں میں مولوی عبدالحق(۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) نے انجمنِ ترقیء اردو، اورنگ آباد کے تحت اہتمام سے ترجمے کرواکے شائع کروادیا تھا ۔اسی طرح کا اہتمام اس وقیع تصنیف کے لیے بھی ضروری تھا۔بہر حال اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۴ء) کی مرضی سے شعبۂ اردو، جامعہ کراچی کے تحت ۱۹۶۰ء میں ایک فرانسیسی خاتون لیلیان سیکستین نازرو نے راست فرانسیسی زبان سے اردو میں کیا، جس کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن پھر بھی مزید نصف صدی گزر جانے کے باوجود یہ ترجمہ تاحال شائع نہیں ہوسکا۔

یہ ترجمہ پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے مقصد سے ایک رسمی اور امتحانی تقاضوں کے مطابق کراچی یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء میں پیش کیا گیا تھا ۔مترجمہ فرانسیسی تھیں۔نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۱۲ء۔۲۰۰۲ء) کی وجہ سے، جو ایک عرصے سے پیرس میں مقیم تھے، ان میں اردو زبان سے رغبت پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو سیکھی اور پیرس کی سوبورن یونیورسٹی اور ادارۃ السنۂ شرقیہ سے فارغ التحصیل ہوئیں ۔ روایت ہے کہ وہ وہاں سفارت خانۂ پاکستان میں ملازمت کے باعث یا کسی اور حیثیت میں وابستہ تھیں۔پھر پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی (۱۸۹۳ء۔۱۹۶۳ء) کی وساطت سے تعلیمی وظیفے پر یہ پاکستان آئیں اور کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بغرضِ حصولِ سند پی ایچ ڈی ،منسلک ہوکر یہ کام کیا، جس کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔'مجلسِ اعلیٰ تعلیم وتحقیق' (Board of Advance Studies and Research) ، جامعہ کراچی کے اجلاس، مؤرخہ ۲۸ر ستمبر ۱۹۶۰ء میں قرارداد نمبر ۱۰ کے تحت اس خاتون کا داخلہ پی ایچ ڈی میں اس سابقہ تاریخ سے منظور ہوا، جب اس خاتون نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔مقالے کے ممتحن ڈاکٹر یوسف حسن خان، پرو وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی، ڈاکٹر عزیز احمد(لندن، معروف ناول و افسانہ نگار اور محقق)اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔زبانی امتحان کے لیے ڈاکٹر یوسف حسن اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نام تجویز ہُوا تھا لیکن کسی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسن خان کی معذرت کے سبب ان کی جگہ ایف۔اے۔کریم فضلی ممتحن نامزد ہوئے۔ان ممتحنین کی سفارش کے نتیجے میں مؤرخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں اس خاتون کو کامیاب قرار دے کر پی ایچ ڈی کی سند دینا منظور کرلیا گیا۔

بظاہر محض کسی کتاب کا ترجمہ اس سند کے لیے قابلِ قبول نہ ہوسکتا تھا اس لیے مترجم نے ترجمے میں مصنف کے بیانات کی تصدیق وتوثیق کے لیے ہم عصر مآخذ سے، جن کے حوالے خود مصنف نے متن میں دیے تھے، اسناد پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مصنف نے جن مقامات پر معلومات تشنہ چھوڑ دی تھیں کہیں کہیں وہاں متعلقہ معلومات کو حواشی میں تحریر کیا ہے یا جن شعرا کے اشعار کا حوالہ مصنف نے دیا تھا یا ان کے ترجمے فرانسیسی میں کیے تھے، لیکن

اشعار نقل نہیں کیے تھے، مترجم نے متعلقہ مآخذ سے ایسے متعدد اشعار کو اخذ کر کے متن ہی میں انھیں شامل کردیا ہے یا اگر وہ اشعار دستیاب نہ ہوئے تو وہاں معذوری ظاہر کردی ہے۔ جہاں کہیں ضروری محسوس ہُوا وہاں نثری عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ سب مترجم کے کیے ہوئے ایسے اضافے ہیں جو اصل فرانسیسی متن میں موجود نہیں۔

مترجم نے اپنی جانب سے ایک اور مزید کوشش یہ کی ہے کہ اپنے تحریر کردہ 'تعارف' کے آخر میں ان مآخذ کی ایک فہرست بھی درج کردی ہے جنھیں مصنف نے پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔اس فہرست میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مترجم نے ان مآخذ کی وہ اشاعتیں درج کی ہیں جو اس کے اپنے پیشِ نظر رہیں، جب کہ مصنف کے سامنے تو ان میں سے اکثر مآخذ اس وقت تک غیر مطبوعہ تھے۔

مترجم نے جہاں متن یا حواشی میں مغربی نام تحریر کیے ہیں وہاں انھیں اردو میں لکھنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن متعدد مقامات پر نام رومن ہی میں رہنے دیے ہیں۔اس کی ایک وجہ بظاہر ان ناموں کا تلفظ بھی ہوسکتا ہے جن کو اردو میں لکھنا مترجم کے لیے ممکن نہ رہا ہوگا۔مترجم نے گارسیں دتاسی کے نام کا املا 'گارساں دتاسی' کیا ہے لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ (١٩٠٩ء۔٢٠٠٢ء) نے، جو فرانسیسی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، 'گارساں' کے لیے 'گارسیں' تلفظ پر اصرار کیا ہے،اس لیے جہاں جہاں مصنف کے نام کو راقم نے تحریر کیا ہے وہاں 'گارسیں' لکھنے کو ترجیح دی ہے۔

اس ترجمہ کا جو مسودہ دستیاب ہے،اس میں جگہ جگہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے قلم سے اضافے اور تصحیحات موجود ہیں۔ اگرچہ مترجم لیلیان نازرو ہیں لیکن اکثر مقامات پر بامحاورہ زبان،روزمرہ، تراکیب اور زبان کے فطری لب و لہجے کو دیکھ کر گمان غالب ہوتا ہے کہ زبان و بیان ہر جگہ مترجمِ مذکور کے نہیں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا قلم صاف جھلکتا ہے اور اکثر مقامات پر یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ زبان یا اسلوب مترجم کا نہیں ہوسکتا۔متعدد مقامات ایسے بھی دیکھے جاسکتے ہیں کہ جہاں زبان کسی غیر اہلِ زبان کی ہو نہیں سکتی۔پھر ایک اور امر بھی قابلِ مشاہدہ ہے کہ زبان اور اسلوب ہر جگہ یکساں نہیں، کہیں کہیں گمان گزرتا ہے، اور حقیقت سے قریب بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا ترجمہ اور اس کا اسلوب و بیان محض مترجمہ کے نہیں اور کسی ایک فرد کے نہیں کم از کم مزید ایک فرد کی کوششوں پر منحصر ہیں۔پھر حواشی اور 'تنقید بر حاشیہ مصنف' کے ذیل میں کچھ ایسی ادبی معلومات بھی ترجمے میں شامل ہیں جن کے بارے میں بھی یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسی معلومات کا پیش کرنا کسی غیر زبان کے اس سطح کے کسی فرد کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ معلومات اردو ادب کے نہایت گہرے اور وسیع مطالعے کا سبب ہوسکتی ہیں۔

اس تصنیف اور اس ترجمے سے قطع نظر اس کا مصنف ہمارے لیے اس اعتبار سے اہم اور قابلِ ستائش ہے کہ اس کا نام ایسے مستشرقین میں شامل ہے جو جنوبی ایشیا کبھی نہ آئے لیکن اپنے ملک میں رہ کر اردو زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق میں جستجو اور انہماک، مستقل مزاجی اور محنت ولگن کا ثبوت دیا،ان میں فرانس کے گارسیں دتاسی[١] کا نام،

خصوصاً انیسویں صدی کے مستشرقین میں، سب سے مختلف اور نمایاں کہا جاسکتا ہے۔ ایک ایسے دَور میں جب اردو زبان علمی زبانوں کی صف میں ابھی شامل نہ ہوئی تھی، نہ اس کی معیاری لغات اور قواعد مرتب ہوئی تھیں، نہ یہ تدریسی زبان بنی تھی اور نہ علمی ذریعۂ اظہار کے قابل سمجھی گئی تھی، نہ اس کی تاریخ کے ارتقائی مدارج اور مراحل کو سمجھنے کا کوئی واضح شعور موجود تھا، نہ ہی اس کے ادب کی تاریخ کو مرتب کرنے کا کوئی احساس کسی کو رہا، ایسے وقت میں گارسیں دتاسی اس زبان کے مطالعہ و تحقیق کی جانب اس طرح متوجہ ہوتا ہے کہ اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کردیتا ہے۔ وہ اس زبان کی روز افزوں مقبولیت اور ترقی کا اندازہ لگا کر اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا ہے اور اس زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے[۲]۔

اس کی شخصیت، حالاتِ زندگی، اس کے علمی انہماک، اس کی اردو خدمات اور اس کی تصانیف وتالیف کے جائزے ومطالعے پر مشتمل متعدد کوششیں اردو زبان میں منظرِ عام پر آچکی ہیں[۳]۔ مثلاً مذکورہ موضوعات پر درج ذیل ماٰخذ مبسوط معلومات فراہم کرتے ہیں:

۱۔ ''گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو'' مصنفہ: محی الدین قادری زور (حیدرآباد، ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۷ء)

۲۔ ''گارسیں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے''، مصنفہ: ثریا حسین (لکھنؤ، ۱۹۸۴ء)

۳۔ ''گارساں دتاسی'' مصنفہ: قاضی عبدالودود (پٹنہ، ۱۹۹۵ء)

ان مبسوط مطالعات کے علاوہ، جن میں سے آخر الذکر مختلف وقتوں میں لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، دیگر ماٰخذ میں سے درج ذیل مقدمات، پیش لفظ، مقالات اور کتابیں بھی قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں:

۱۔ عبدالحق ''مقدمہ''، مشمولہ: ''خطباتِ گارساں دتاسی'' (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، اشاعتِ دوم، کراچی ۱۹۲۴ء)

۲۔ محمد حمید اللہ ''اختتامیہ''، مشمولہ ''مقالاتِ گارسیں دتاسی''، جلد اول (کراچی، ۱۹۶۴ء)

۳۔ آغا افتخار حسین ''یورپ میں تحقیقی مطالعے''، (لاہور، ۱۹۶۷ء)

۴۔ آغا افتخار حسین ''یورپ میں اردو''، (لاہور، ۱۹۶۸ء)

۵۔ تنویر احمد علوی ''مقدمہ''، مشمولہ: ''رسالۂ تذکرات'' مصنفہ: گارسیں دتاسی، اردو ترجمہ، مولوی ذکاالله دہلوی (دہلی، ۱۹۶۸ء)

۶۔ رضیہ نور محمد ''اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (لاہور، ۱۹۸۵ء)

۷۔ سلطان محمود حسین ''تعلیقاتِ خطباتِ گارسیں دتاسی''، (لاہور، ۱۹۸۷ء)

۸۔ ''تعلیقاتِ خطباتِ گارساں دتاسی''، تبصراتی مقالہ، معین الدین عقیل، مشمولہ: ''اردو تحقیق: صورتِ حال اور تقاضے'' (اسلام آباد، ۲۰۰۸ء)

گارسیں دتاسی کی ان تصانیف پر، جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے، مفصل معلومات ثریا حسین نے اپنے مذکورہ بالا مبسوط مقالے میں یکجا کردی ہیں اور اس کی تمام تصانیف و تالیفات کی ایک بہت جامع فہرست بھی اپنے مقالے کے آخر میں شامل کردی ہے، جن کی مجموعی تعداد ۱۵۵ ہے۔ ان سے قطع نظر گارسیں دتاسی کی جو تصانیف اردو میں ترجمہ ہوئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ ''تذکرہ طبقات الشعراء ہند'' مولفہ مولوی کریم الدین پانی پتی (دہلی، ۱۸۴۷ء)؛ گارسیں دتاسی کی تصنیف ''تاریخ ادبیاتِ ہندوی وہندوستانی''، Historie de la Litterature Hindoui et Hindoustani (پیرس، ۱۸۳۹ء) سے ماخوذ معلومات پر مشتمل، جن کو فرانسیسی سے ایف۔ فیلن (F. Falon) نے انگریزی میں اور مولوی کریم الدین نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا[۲]۔

۲۔ ''تذکراتِ گارسان دتاسی'' ترجمہ: مولوی ذکا اللہ دہلوی (دہلی، ۱۸۵۴ء)؛ اس کتاب کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ (''رسالۂ تذکرات۔ دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

۳۔ ''تذکرہ مختصر احوال مصنفین ہندی'' مولوی ذکا اللہ دہلوی نے اصل تصنیف: Les Auteurs Hinsdoustanis et Levres Ourage (پیرس، ۱۸۵۵ء) سے اردو میں ترجمہ کیا (دہلی، ۱۸۵۵ء)؛ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن گارسیں دتاسی نے Les Auteurs Hindoustanis et Levres Ouvrages d 'Apress le Biographies Orignales کے نام سے مرتب کیا، تو اس کے ایک جزو کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے ''اردو کے تذکرے'' کے عنوان سے شائع کیا۔ مشمولہ ''اردو'' (کراچی، جنوری ۱۹۵۰ء)۔

۴۔ ''خطباتِ گارساں دتاسی'' مذکورہ بالا۔

۵۔ ''مقالاتِ گارساں دتاسی'' بہ تصحیح ڈاکٹر محمد حمید اللہ (کراچی، ۱۹۷۵ء)

۶۔ ''تمہیدی خطبے'' بہ تصحیح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (دہلی، ۱۹۴۱ء)

گارسیں دتاس نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے جو کام کیے، انھیں ان درج ذیل اقسام کے تحت دیکھا جاسکتا ہے:

۱۔ فرانسیسی زبان میں اردو زبان وادب سے متعلق تحریریں۔

۲۔ اصل اردو متون کی ترتیب و تدوین، اور

۳۔ اردو کتابوں اور تحریروں کے تراجم، فرانسیسی زبان میں۔

یہاں اس جائزے میں ۲ اور ۳ سے ہمیں غرض نہیں۔ فرانسیسی میں گارسیں دتاسی نے اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں یا مقالات تحریر کیے، ان میں معلومات کی فراوانی کے لحاظ سے اس کے وہ خطبات جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال دیا کرتا تھا اور جو اردو میں ''خطباتِ گارساں دتاسی'' کے عنوان سے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد

سے۱۹۳۵ء میں، ''مقالاتِ گارساں دتاسی'' کے نام سے دہلی سے۱۹۴۳ء میں اور پھر کراچی سے۱۹۶۴ء میں شائع ہوئے۔ پھر ''تمہیدی خطبات'' کے نام سے بھی اس کے ابتدائی سالوں کے خطباتِ دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے۔ ان سب سے قطع نظر''تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی'' Histoire de la Litterature Hindoui et Hindoustaniاس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس نے یہ تاریخ۱۸۳۹ء میں مکمل کی، لیکن وہ اس حد تک اس کے لیے مواد جمع کر چکا تھا کہ وہ سارا دستیاب شدہ مواد اس جلد میں سمیٹ نہ سکا، چناں چہ اس نے جب اس کتاب کو اشاعت کے لیے دیا تو اسے جلد اول قرار دینا مناسب سمجھا اور پھر مزید مواد کی فراہمی و ترتیب میں مصروف رہا۔ پہلی جلد کے اختتام تک مزید حاصل شدہ مواد اور پھر بعد میں موصولہ مواد کو ترتیب دے کر اسے اس نے دوسری جلد کے طور پر ۱۸۴۷ء میں شائع کر دیا۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہُوا، وہ مسلسل مواد جمع کرتا رہا اور اسے اپنے خطبات کی صورت میں ہر سال مرتب اور پیش کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی تاریخ کی کسی اگلی جلد یا جلدوں کی اشاعت سے بہتر یہی مناسب سمجھا کہ کل دستیاب مواد کو اب ایک مزید ضخیم تاریخ کے طور پر مرتب کرنا چاہیے۔ اس طرح اس کی یہ تاریخ ۲۳سال کے بعد تین جلدوں میں شائع ہونا شروع ہوئی۔ چناں چہ اس کی پہلی اور دوسری جلد۱۸۷۰ء میں اور تیسری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔

اس تاریخ کی اوّلین اشاعت کی پہلی جلد۱۸۳۹ء میں پیرس سے 'مجلسِ تراجم شرقیہ برطانیہ عظمٰی و آئر لینڈ' Oriental Translation Committe, Great Britain and Irelandکے زیرِ اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اس پہلی جلد کا ذیلی عنوان ''سوانحات اور کتابیات''Biographie et Bibliographieسرورق پر تحریر تھا، جس سے اس جلد کے موضوع اور مندرجات کی وضاحت ہوتی ہے۔ گارسیں دتاسی نے اس کا انتساب مورخہ۱۵/اپریل۱۸۳۹ء کو تحریر کیا تھا، جو ملکۂ برطانیہ کے نام تھا۔ پھر اس کا پیش لفظ تحریر کیا ہے، جو۱۶صفحات پر محیط ہے۔ اس پیش لفظ کے اہم مطالب کا خلاصہ قاضی عبدالودود نے اردو میں تحریر کیا تھا۔[۵] اس کے بعد شاعروں اور مصنفین کا تذکرہ ہے جو رومن حروفِ تہجی میں A سے Z تک ہے۔ یہ متن کل۵۵۴صفحات پر مشتمل ہے، پھر ضمیمہ ہے جو تذکروں کے تعارف اور کتابیات پر مشتمل ہے اور یہ صفحہ ۵۵۵سے۶۰۵ تک پھیلا ہُوا ہے۔ اس کے بعد اشاریہ ہے جو اشخاص کے لیے صفحہ۶۰۷ سے۶۱۷ تک اور اسمائے کتب کے لیے ۶۱۸ سے۶۳۰ تک محیط ہے۔ اس آخری صفحہ پر فرانسیسی زبان میں ''پہلی جلد کا اختتام'' تحریر ہے۔[۶]

دوسری جلد اسی عنوان سے۱۸۴۷ء میں مجلس مذکورہی کے اہتمام سے پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ کل۶۰۸صفحات پر مشتمل تھی۔ سرورق کی پشت یا صفحہ۲پر ایک عبارت فرانسیسی میں تحریر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب ایسٹ انڈیا کمپنی (۷۰۔ لیڈن ہال اسٹریٹ، لندن) کی اجازت سے سرکاری مطبع پیرس سے شائع کی جارہی ہے۔ سرورق کے

بعد ۲۰۲ صفحات پر مشتمل پیش لفظ ہے جس میں گارسیں دتاسی نے ہندی اور اردو شاعری کی اصناف کا تعارف حروفِ تہجی کی ترتیب سے تحریر کیا ہے اور پھر صنائع و بدائع اور ادبی اصطلاحات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے کا ترجمہ بھی قاضی عبدالودود نے مذکورہ مقالے میں جلد اول کے مقدمے کے بعد شامل کیا ہے۔ متن کا آغاز صفحہ ا سے کیا گیا ہے اور یہ اقتباس اور ان کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ چناں چہ سرورق پر اس جلد کا موضوع ذیلی عنوان کے طور پر تحریر کر دیا گیا ہے:Extraits et Analyses۔متن کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے اقتباس نقل کیا گیا ہے پھر اقتباس سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یوں یہ متن صفحہ ۶۰۴ پر مکمل ہوتا ہے۔ صفحہ ۶۰۵ سے ۶۰۸ تک فہرستِ مندرجات ہے۔

اس تصنیف کا دوسرا ایڈیشن خاصے اضافوں کے ساتھ' ایشیا ٹک سوسائٹی ،پیرس' کے زیرِ اہتمام تین جلدوں میں شائع ہوا۔سرورق پر''دوسری اشاعت'' کے ساتھ تحریر ہے کہ ''نظرِ ثانی ،تصحیح اور خاصے اضافوں کے ساتھ''۔پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، جو پیش لفظ کے ۴ اور متن کے ۶۲۴ صفحات پر مشتمل تھی۔ متن میں ۷۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے،جس میں مصنف نے اردو زبان اور اس کے اسالیب اور اس کتاب کے مآخذ کا تعارف تحریر کیا ہے اور ذیل میں ادبی اصناف اور اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور پھر تذکروں کا تعارف کرایا ہے، جو اس کتاب کے مآخذ کی حیثیت میں اس کے پیشِ نظر رہے ۔ یہ تذکرے تعداد میں ۶۶ تھے۔ متن کا وہ حصہ جو صفحہ ۷۳ سے شروع ہوتا ہے، شعراء و مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے اور حروفِ تہجی کی ترتیب میں مولوی مظہر علی حضوری کے ترجمہ پر ختم ہوتا ہے ۔آخر میں صفحہ ۶۱۹ سے ۶۲۴ تک محمد عاجز کے ''قصۂ لعل و گوہر'' پر وضاحتی وتنقیدی شذرہ تحریر کیا ہے، جس کا ذکر اس نے صفحہ ۶۸۔۶۹ پر متن میں کیا تھا۔ اس طرح یہ جلد صفحہ ۶۲۴ پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری جلد بھی ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی جو رومن حرف I اور عبارت حاجی مرزا عابد علی بیگ زائر کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حکیم سید عنایت حسین رسوا تک کا ترجمہ شامل ہے، جو صفحہ ۵۹۴ پر ہے۔ اسی صفحہ سے مستعان شاہ مدارسی اور الٰہی بخش نشاط کے ذیل میں ان کی مذکور مثنویوں پر اضافی معلومات درج کی ہیں، جو صفحہ ۶۰۸ تک محیط ہیں۔

تیسری جلد ایک سال کے بعد ۱۸۷۱ء میں اسی اہتمام اور تسلسل میں شائع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک استدراک سے ہوتا ہے، جو ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اسے ۵/اکتوبر ۱۸۷۱ء کو تحریر کیا۔ اس میں سابقہ دو جلدوں کے مندرجات میں حرف''ک''(k)،''و''(W) تک شروع ہونے والے مصنفین و شعراء کے تراجم مختصراً شامل کیے ہیں۔خواتین کے ناموں کی فہرست اسی ذیل کے آخر میں شامل کی گئی ہے۔

اس جلد کا متن حرف''س'' کے اولین شاعر میر سعادت علی کے ترجمہ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳۵۴ پر مولوی ذوالفقار علی کے ذکر پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۳۵۵ سے ۳۷۶ تک اختتامیہ تحریر ہے،جس میں تصحیح و اضافے کیے

گئے ہیں۔ اس کے بعد ضمیمے ہیں۔ ضمیمۂ اول کتابوں کی وضاحتی فہرست پر مبنی ہے، جن کا ذکر متن میں بطور حوالہ یا استناد آیا ہے۔ یہ ضمیمہ صفحہ ۴۷۷ سے ۴۸۸ تک، ان ہی کتبِ حوالہ کی فہرست ہے اور اسے بھی حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ آخر میں مفصل اشاریے ہیں، جو اوّلاً اسمائے رجال، صفحہ ۴۸۹ سے ۵۵۰ تک اور پھر اسمائے کتب صفحہ ۵۵۱ سے آخری صفحہ ۶۰۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

گارسیں دتاسی کی اسی کتاب کی دوسری اشاعت ۹۷ سال کے بعد ۱۹۶۸ء میں (فرانسیسی زبان ہی میں) نیویارک سے منظر عام پر آئی، لیکن افسوس کہ اس اہم تصنیف کا اب تک کوئی مکمل ترجمہ اردو یا انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوا[۸]، جو جنوبی ایشیا کے قارئین کے لیے قابلِ استفادہ ہوتا۔ اس کے مقدمہ اور اوّلین صفحات کے ترجمے ضرور ہوئے، مثلاً: اس کے مقدمے کا انگریزی ترجمہ گیتا کرشن کٹی نے *Indian Literature* (دہلی، مئی۔جون ۱۹۸۴ء) میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصے ''گلِ بکاؤلی'' کے فرانسیسی میں گارسیں دتاسی کے تحریر کردہ خلاصے کا بھی انگریزی میں ایک ترجمہ تھامس فلپ (Thomas Phillip) نے کیا، جو ڈبلیو، اے۔ کلوسٹن (W.A.Clouston) کی مرتبہ کتاب *A Group of Eastern Romances* میں Rose of Bakauali کے عنوان سے شامل ہُوا۔ یہ کتاب لندن سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

افسوس یہ تصنیف اپنے موضوع اور اپنی معلومات پر نہایت اہم ہونے کے باوجود ابھی تک اردو میں مکمل ترجمہ نہیں ہوئی اور جس حد تک اس کا ترجمہ ہوا وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے ایک انگریزی ترجمے کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ کسی شخص نے جو پانڈی چری میں مقیم تھا، اس کی ایک جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، جس کا مسودہ اس نے نواب نصیر حسین خاں خیال (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۴ء) کو ملاحظے اور اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا۔ نواب صاحب نے یہ انگریزی ترجمہ اردو میں منتقل کرنے کے لیے محمد محفوظ الحق (۱۹۰۰ء۔۱۹۴۶ء) کو دے دیا۔ جنھوں نے اس جلد کا ترجمہ تو نہ کیا لیکن اس کے مقدمے کا ترجمہ کر کے اُسے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں گارسیں دتاسی کے اوّلین تعارف کے طور پر اگست ۱۹۲۲ء میں اور پھر مقدمہ کا ترجمہ ستمبر ۱۹۲۲ء کے شماروں میں شائع کیا۔

اس کتاب کی تصنیف کے لیے دتاسی نے جو محنت کی ہے، جس جستجو کا ثبوت دیا ہے، اور جس لگن اور مشقت سے معلومات یکجا کی ہیں، اس کتاب کے ہر صفحے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنے ذوق و شوق کے تحت اس کے لیے مواد اور معلومات حاصل کرتا رہا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اس نے اردو سے محبت کے ذیل میں، اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اور پھر اپنے مطالعے کو وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کرنے کے لیے علمِ عروض اور بیان و بدیع تک سے واقفیت حاصل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی کہ تقطیع کے اصولوں اور بحروں سے شناسائی کا بھی وہ جا بجا ثبوت دیتا رہا ہے اور ساتھ ہی تاریخ گوئی سے اپنی واقفیت کی مثالیں بھی اس نے پیش کی ہیں۔

مصنف نے اسی ذیل میں یہ بھی بتادیا ہے کہ کون کون سی کتابیں اس نے بالمشافہ دیکھی ہیں۔ وہ اسے کس طرح حاصل ہوئیں، کس کس کے توسط سے ملیں، وہ کن کن کتب خانوں میں قلمی یا غیر مطبوعہ، موجود ہیں اور خود اس کے ذاتی ذخیرے میں ان میں سے کون کون سی کتابیں موجود ہیں۔اس طرح ایک فہرستِ کتب اس کے کتب خانے کی ایسی بن سکتی ہے جو شاید اس فہرست میں اضافہ ثابت ہو جسے قاضی عبدالودود نے تیار کیا تھا[۹]۔اس پر مستزاد گارسیں نے جگہ جگہ معاصر معلومات، خصوصاً مطبوعات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان اخبارات کا حوالہ بھی دیا ہے جن سے اسے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔ یہاں یہ پتا چلتا ہے کہ متعدد معاصر اخبارات بھی اس تک پہنچتے رہے جن سے اس نے براہِ راست استفادہ کیا۔اس کے ذخیرہ کتب میں یقیناً معاصر اخبارات بھی موجود تھے جن کی حفاظت اور فہرست سازی کا شاید وہاں کسی نے اہتمام کیا ہو تو آج اس کی افادیت ظاہر ہے۔

اس زمانے میں کہ جب سیاسی عزائم کے تحت ہندوؤں میں اردو کے خلاف نفرت کے جذبات عام ہو رہے تھے یا عام کیے جا رہے تھے اور ہندی کی حمایت میں خلافِ حقیقت شواہد اور دلائل پر اصرار کیا جا رہا تھا، دتاسی نے اردو کی حمایت میں اپنے خیالات جس طرح اپنے مقدمے میں بیان کیے ہیں اس سے اس کی غیر جانبداری، حقیقت پسندی اور میانہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔اسے مذہب سے بھی خاصی دل چسپی تھی۔ وہ جن افراد کا تذکرہ کرتا ہے، اگر اسے ان کے مذہب کے بارے میں علم ہوتا ہے تو وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ اس کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اگر ایسے افراد کا وہ ذکر کرتا ہے جنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے، یعنی ہندو سے یا مسلمان سے عیسائی ہوئے ہوں یا ہندو سے، عیسائی و یہودی سے مسلمان ہوئے ہوں تو ایسے حوالے وہ بالعموم دیتا رہا ہے۔ان حوالوں کے ذریعے کئی طرح کے مطالعات میں ان موضوعات کے ضمن میں بھی دتاسی کی اس کتاب سے مدد لی جا سکتی ہے۔

گارسیں نے جہاں افراد کے بارے میں اپنی معلومات بیان کی ہیں وہیں ان افراد کی تحریر کردہ تصانیف کے بارے میں بتایا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ۔اگر مطبوعہ ہے تو کہاں سے یا کہاں کہاں سے چھپی ہے اور اس کے کتنے اڈیشن اس کے علم میں ہیں۔اسی ذیل میں اس نے بالعموم مطابع کا بھی بالالتزام حوالہ دے دیا ہے جہاں سے کتاب چھپی ہے اور یہ بھی کہ اس مطبع کا مالک یا مہتمم کون ہے؟ اور یہ بھی مزید بتادیا ہے کہ اس مطبع سے اگر کوئی اخبار چھپتا ہے تو کونسا اخبار چھپتا ہے اور اس کا مدیر کون ہے۔اس لحاظ سے اگر مطابع اور اخبارات و جرائد کی کوئی فہرست مرتب کرنا ہو یا مطابع اور صحافت کی تاریخ مرتب کرنی ہو تو گارسیں کی یہ تصنیف ایک ناگزیر ماخذ ہے۔

اس اہم تصنیف کا تاحال یہ ترجمہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود غیر مطبوعہ رہا ہے اور محض اس کا وہ مقدمہ جسے مترجم نے تحریر کیا تھا، Karachi University Studies کے شمارہ اگست ۱۹۶۶ء میں شائع ہو سکا تھا۔

جامعہ کراچی کے میرے مستقل یا باقاعدہ زمانۂ طالب علمی (۱۹۶۵ء۔۱۹۶۹ء) میں سننے میں آتا تھا کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس کی اشاعت کے لیے "مجلس ترقیء ادب" (لاہور) اور "مرکزی اردو بورڈ" (لاہور) سے کوشاں تھے، لیکن نہ معلوم کیوں یہ اہم کتاب ان اداروں سے شائع نہ ہوسکی۔اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا متن، جو ٹائپ شدہ ہے، دست بردِ زمانہ اور بار بار حصولِ عکس کے (بذریعۂ زیروکس) عمل سے گزرنے کی وجہ سے مدھم ہوکر متعدد مقامات پر پڑھنے میں دشوار ہوگیا ہے اور متعدد صفحات کا مکمل عکس بھی نہیں لیا جاسکا۔ پھر کہیں کہیں ٹائپ کرنے والے نے بھی بے نیازی برتی ہے، یہاں تک کہ الفاظ چھوڑ دیے ہیں اور جملے نامکمل بھی رہنے دیے ہیں۔اشاعت کے لیے اس طرح کے متن کی تدوین اور کتابت خاص توجہ اور اہتمام کی متقاضی تھی جو شاید خود ناشر کے لیے گوارا نہ تھی اور شاید اپنی مصروفیات کے سبب خود ڈاکٹر ابواللیث صاحب کے لیے یہ ہفت خواں طے کرنا ممکن نہ ہوا، جب کہ اس مقصد کے لیے اصل فرانسیسی متن سے ترجمہ شدہ متن کا مقابلہ ناگزیر بھی تھا تاکہ ٹائپ شدہ مسودے کی مذکورہ کمزوریوں کو دُور کیا جاسکے۔

قریباً ۱۹۹۱ء کے آغاز میں شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر جمیل اختر خاں (۱۹۴۱ء۔۲۰۰۰ء) نے شعبۂ اردو کی اپنی صدارت کے دوران شعبے کے ایک تحقیقی مجلّے کی اشاعت کا منصوبہ منظور کرایا تھا اور اس مقصد کے لیے راقم الحروف کو بھی ذمے داری سونپی تھی، چناں چہ اس کے لیے مقالات کے حصول اور ان کی کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ خود راقم الحروف نے بھی اس مجلّے کے لیے ملک اور بیرون ملک کے محققین سے اس کے لیے مقالات حاصل کیے تھے۔مرحوم نے کتاب خانۂ محمود حسین جامعہ کراچی سے اس ترجمہ کی دونوں جلدیں اس ارادے سے حاصل کی تھیں کہ یہ ترجمہ قسطوں میں اس مجلّے میں شائع کردیا جائے گا۔ اس کے ایک ابتدائی حصے کو کتابت کے لیے بھی دے دیا گیا لیکن نامعلوم وجوہات کے باعث نہ یہ مجلّہ شائع ہُوا نہ اس کے مقالات اور کتابت شدہ مواد کے بارے میں کچھ علم ہُوا، کیوں کہ راقم الحروف ایک طویل رُخصت پر پہلے یورپ اور پھر جاپان چلا گیا اور یہاں کے حالات ومعاملات سے لاتعلق وبے خبر رہا۔اس ترجمے کی دونوں جلدیں، جو مرحوم کی میز پر راقم الحروف نے بار ہا دیکھی تھیں، بعد میں کہیں نظر نہ آئیں۔محض اس کی ایک جلد سے اقتباس لینے کے لیے صرف ایک دن کے لیے مرحوم نے اس کا عکس بنوانے کی خاطر میرے سپرد کی تھی جو عکس بنوانے کے بعد میں نے دوسرے ہی دن مرحوم کو لوٹا دی تھی۔کاش دوسری جلد بھی مرحوم اسی طرح ایک دن کے لیے ہی سہی مرحمت فرما دیتے تو اس کا عکس بھی بنوا کر محفوظ کرلیا جاتا۔بعد میں یہ دونوں اصل جلدیں، ایک عرصے تک جہاں جہاں امکان ہوسکتا تھا وہاں بظاہر موجود اور دستیاب نہ ہوئیں، لیکن بالآخر دوسری جلد کا عکس بھی، جو ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی ملکیت تھی، اس لائبریری کے ایک کرم فرما جناب خالد حسین (۱۹۵۶ء۔) کی جستجو کے نتیجے میں مجھے دستیاب ہوگیا تو اس تاریخ کا مکمل ترجمہ شدہ متن پیش کرنا

ممکن ہوگیا۔ چناں چہ میں نے جامعہ کراچی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی (۱۹۴۳ء۔) سے اس کی اشاعت کی اجازت کے لیے گزارش کی تو موصوف نے، جن کا اپنے منصب سے اخلاص، علم دوستی، نیکی و شائستگی اور دیانت کراچی یونیورسٹی کی تاریخ میں، ان کی نظامت کے بعد کے ادوار کے لیے ایک مثال ہے، بحیثیت شیخ الجامعہ کمال ذوق وشوق سے اجازت مرحمت فرمادی۔

جب اس ترجمے کو مبیّضہ تیار کرنے کے لیے پڑھنا شروع کیا گیا تو اس کے مسودے کی مذکورہ کیفیت کی وجہ سے یہ کام آسان نہ تھا۔ خوش قسمتی سے راقم کے پاس گارسیں دتاسی کی متعدد کتابوں کے علاوہ اس تاریخ کی اوّلین اشاعت کی دونوں جلدیں عکسی صورت میں، جب کہ دوسرے اڈیشن کی تینوں جلدیں اصل اور مکمل حالت میں موجود ہیں۔ چناں چہ مسودے کو کتابت سے پہلے اور پروف خوانی کے مرحلے میں بار بار اصل کتاب سے، جو بہت پُرانی ہونے کی وجہ سے خاصی خستہ اور بوسیدہ ہوچکی ہے اور کاغذ بھی زردی مائل ہوجانے کی وجہ سے، مقابلہ خاصہ دشوار ثابت ہُوا، لیکن یہ مرحلہ بہر حال طے ہوا۔ پھر مترجم نے جہاں جہاں حواشی تحریر کیے تھے یا مصنف کی چھوڑی ہوئی معلومات میں اضافہ کیا تھا، انھیں مقالے کے ٹائپسٹ کی کوتاہیوں، مسودے کی خستگی، عکس درعکس کی کوششوں کی وجہ سے متن کے قرأت کے قابل نہ رہنے کے باعث یہاں کاملاً نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے بڑی احتیاط کے ساتھ حالیہ ترتیب و کتابت کے وقت وہ حواشی مکمل یا ان کا نفسِ مضمون متن میں اس طرح شامل کردیا گیا ہے کہ معلومات یا نفسِ مضمون متاثر نہ ہوں۔ اس طرح اس ترجمے کو معلومات کے لحاظ سے اصل فرانسیسی متن سے قدرے زیادہ مفید سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کام میں گارسیں دتاسی سے جہاں جہاں سہو ہُوا ہے، یا معلومات غلط یا تشنہ رہی ہیں، ان میں سے کچھ کی نشاندہی قاضی عبدالودود (۱۸۸۴ء۔۱۹۸۴ء) نے اپنے فاضلانہ اور محققانہ مذکورہ مقالات میں کردی تھی، کچھ نشاندہی خود مترجمہ نے ''تنقید و تحشیہ بر دیباچۂ مصنف'' کے تحت اور متن میں متعدد مقامات پر کی ہے، اور آغا افتخار حسین (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۴ء) اور غلام حسین ذوالفقار (۱۹۲۴ء۔۲۰۰۷ء) نے بھی اپنی مذکورہ کاوشوں میں اپنے زیر بحث موضوعات کے ذیل میں ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ پھر دتاسی کا جو دیباچہ اس کتاب میں شامل ہے اس میں بیان کردہ گارسیں کے خیالات سے بعض مقامات پر بظاہر مترجم نے ''تنقید و تحشیہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس پر قوی گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں بیان کردہ معلومات اور ساتھ ہی اسلوب دراصل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ متن میں بھی متعدد مقامات پر مترجم نے اشعار نقل کر کے ان کا استناد تذکروں سے پیش کیا ہے، جسے مترجمہ کا اہتمام یا کاوش تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ مترجم نے متن کے ترجمے کے ساتھ ساتھ متعدد مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور کچھ اضافی اور تازہ معلومات بھی شامل کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ گارسیں کے

متعدد بیانات پر تنقید اور ان کی تصحیح بھی کی ہے، جو تنہا ان کی کوشش معلوم نہیں ہوتی۔ پھر قلم اور تحریر کی پختگی بھی مظہر ہے کہ یہ سب مترجم کی کاوشیں نہیں ہوسکتیں۔

یہ ترجمہ اگرچہ دو جلدوں پر محیط تھا،لیکن افسوس ترجمے میں مترجم نے اختصار سے کام لیا اور مطالب اور مباحث کی تفصیلات کو حذف کر کے محض بنیادی معلومات تک ترجمہ کو محدود رکھا ہے اور پھر ہندی زبان و ادب سے متعلق تمام موضوعات بھی حذف کردیے، جو اصل کتاب کا ایک شریک حصہ تھے۔ اس طرح ہندی زبان و ادب سے متعلق متن کو خارج کرکے اس کتاب کے عنوان سے ہندوی کا لفظ بھی حذف کردیا جس کا بظاہر جواز موجود تھا۔واضح رہے کہ گارسیں دتاسی دیگر مستشرقین کی طرح اردو کے لیے بالعموم ''ہندوستانی'' کا لفظ استعمال کرتا رہا ہے لیکن اس نے اس زبان کے لیے جگہ جگہ ''اردو'' اور کہیں کہیں ''لشکری بولی'' اور ''ریختہ'' بھی استعمال کیا ہے۔

اس طرح کی کمزوریوں کے باوجود بحیثیت مجموعی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ گارسیں دتاسی کی یہ تصنیف معلومات کا خزانہ ہے اور اپنے موضوعات کی حد تک جتنی معلومات شاعروں اور مصنفوں کے بارے میں گارسیں نے اس میں یکجا کردی ہیں، اس تصنیف کے وقت تک کسی اور ماخذ میں ، شعرا کے ضخیم سے ضخیم تذکروں کے بشمول ، نظر نہیں آتیں۔اگرچہ مصنف نے کسی مربوط تاریخ کے بجائے اس وقت تک کی عام روایت'' تذکرہ نویسی'' کے انداز میں اسے لکھا ہے لیکن اس کا تحریر کردہ طویل مقدمہ (پیشِ لفظ) اس انداز سے مختلف ہے۔متن میں شعراء اور مصنفین کا تذکرہ اس نے حروفِ تہجی کی ترتیب سے کیا ہے اور ان سے متعلقہ تمام دستیاب معلومات کو وہاں جمع کردیا ہے اور بالعموم اپنا ماخذ بھی بتادیا ہے کہ اسے اُس شخص کے بارے میں معلومات کہاں سے ملی ہیں۔ اس طرح اب کسی شخص پر کوئی مزید کام کرنا چاہے تو دتاسی کی اس تصنیف میں درج ماخذ کے توسط سے ایک رہنمائی آسانی سے میسر آسکتی ہے۔بالعموم یہ مآخذ ہم عصر مآخذ ہیں اس لیے اور بھی اہم اور ناگزیر ہیں۔یہ بھی ایک امتیاز اس تصنیف کا ہے کہ اس میں شامل ایک بہت بڑی تعداد ایسے شعراء و مصنفین کی ہے جن کے نام یا جن کے بارے میں معلومات نہ کسی تاریخ ادب میں اور نہ کسی تذکرے میں ملتی ہیں۔اکثر افراد کے لیے کتابوں و مطبوعات اور مطابع کے بارے میں معلومات کے لیے یہ تصنیف واحد ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے ہر طرح کے معیاری مطالعے اور استناد کے لیے یہ ہمیشہ ناگزیر رہے گی۔

اسناد اور حواشی:

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے، جو فرانسیسی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، دتاسی کے نام کے لیے ''گارسیں'' تلفظ پر اصرار کیا ہے۔

۲۔ اس ضمن میں اس کے خیالات کے لیے: ''خطبات گارساں دتاسی'' (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء) ص ۴۶۔۴۹ وبعدہٗ۔

۳۔ ۱۷۹۴ء میں فرانس کے مغربی ساحلی شہر مارسلیز میں پیدا ہوا۔۱۸۱۷ء میں پیرس پہنچ کر اس وقت کے معروف مستشرق سلویسترِ دی ساسی(Slivestre de Sacy) کی شاگردی اختیار کی اور فارسی،عربی ،ترکی زبانیں سیکھیں۔۱۸۲۲ء میں ادارۂ شرقیات(Societey Asiatica) کا معتمد نامزد ہوا۔ اس عرصہ میں اسے اردو زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہُوا، جس کے لیے اس نے انگلستان کا سفر کیا ور اردو دان انگریزوں سے یہ زبان سیکھی۔واپس آ کر ۱۸۲۸ء می پیرس کے السنۂ شرقیہ کے اسکول میں اردو(ہندوستانی) کا استادمقرر ہُوا۔پھرساری عمر اسی حیثیت میں اردو تدریس وتحقیق میں منہمک رہا۔۱۸۷۸ء میں انتقال ہوا۔

۴۔ اردو تذکرہ نویسی پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں اس تذکرے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، مثلاً:سید عبداللہ ''شعرائے اردو کے تذکرے''(لاہور،۱۹۵۲ء)ص۶۴۔۷۱؛ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''اردوشعراء کے تذکرہ نویسی'' (لاہور،۱۹۷۲ء)؛لیکن ان سے قطع نظر قاضی عبدالودود اور محمد محفوظ الحق کے مضامین مشمولہ'' گارسان دتاسی'' مصنفہ قاضی عبدالودود (پٹنہ،۱۹۹۵ء) ص۱۵۱۔۱۸۴؛ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،''طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین''مشمولہ: ''صحیفہ''(لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء) ص۹۔۳۰؛ قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں۔

۵۔ ''تاریخِ ادبیاتِ ہندوی وہندوستانی ''، جلد اول کی اشاعتِ اول'' مشمولہ: ''گارساں دتاسی'' (پٹنہ،۱۹۹۵ء) صفحہ۳۹۔۶۲۔

۶۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر آغاافتخار حسین نے اس جلد کو ۶۴۶ صفحات پر بتایا ہے:''یورپ میں تحقیقی مطالعے'' (لاہور۱۹۶۷ء)صفحہ۵۱۔

۷۔ ص۳۹۔۴۱

۸۔ اس کی تصانیف میں سے صرف ایک تصنیف کے انگریزی ترجمے کاعلم ہوتا ہے *Memoire sur des picuicularties de la Reglion Musalmane dans I'Inde d'Apres les ouvrages Hindoustani* پیرس سے ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا موضوع ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد اور ان کی رسومات سے متعلق تھا۔ اس موضوع سے متعلق اپنی تصنیف سے قطع نظر گارسان دتاسی نے مسز میر حسن علی کی تصنیف *Observations on the Muslamans of India* (مطبوعہ۱۸۳۴ء)اور جعفر شریف کی تصنیف *Qanun-i- Islam* (مطبوعہ۱۸۳۲ء) پر تبصرے لکھے تھے، جو پیرس کے تحقیقی مجلّوں،علی الترتیب: *Nouveau Journal Asitique*(جون۱۸۳۳ء)اور *Journal des Savantes*(اگست،ستمبر۱۸۳۳ء) میں شائع ہوئے۔ان تینوں تصانیف کا ایک انگریزی ترجمہ ایم ۔ وسیم نے ایک مجموعے کی صورت میں*Muslim Festivale in India and other essays*کے عنوان

سے کیا، جو دہلی سے۱۹۹۵ء میں شائع ہُوا۔ مترجم نے اس ترجمہ کو مفید بنانے کے لیے حواشی بھی تحریر کیے اور آغاز میں ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر گارسیں دتاسی اور اس کی تصانیف کے تعلق سے مفید معلومات یکجا کیں۔ اس مترجم نے گارسیں دتاسی کا اسی سلسلے میں ایک مقالہ،...Notice sur les fetes des Hindus جو اس نے ہندوؤں کے عقائد و رسومات کے تعارف میں تحریر کیا تھا، اور Journal Asiatique Nouveau u فروری اور مارچ ۱۹۳۴ء شائع ہُوا تھا، انگریزی میں ترجمہ کیا اور جوان ہی کے مرتبہ ایک مجموعۂ مقالات میں On becoming an Indian Muslim نامی کتاب،مطبوعہ دہلی ۲۰۰۳ء میں بطور ضمیمہ Notice on the fetes of Hindus according to Hindustani Works کے عنوان سے شائع ہُوا۔ اسی نوعیت کا ایک تنقیدی مطالعہ ایک فرانسیسی اسکالر Robert Arouin نے فرانسیسی میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے بعنوان: Critical study of Garcin de Tassy's Historie de la Litterature Hindoui et Hindoustanei چار جلدوں میں تحریر کیا اور ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن یورپین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی میں پیش کر کے ۱۹۷۷ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

۹۔ ''فہرستِ کتب خانہ گارساں دتاسی''، مشمولہ: ''نوائے ادب''(بمبئی)، جنوری، ۱۹۵۸ء؛ و نیز مشمولہ: قاضی عبدالودود، ''گارساں دتاسی''، محولہ بالا، ص ۱۱۵۔۱۴۰

(''تاریخِ ادبیاتِ اردو''، مصنفہ: گارسین دتاسی کے اردو ترجمے از لیلیان سیکستین نازرو کے مقدمے، از معین الدین عقیل کا ایک حصہ۔ زیرِ طبع: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی)